Rooh-e-Tahqeeq, Vol.04, No.01, Serial No. 11, January – March 2026

The Historical, Geographical and Cultural Significance of the Prominent Cities of Bilad al-Sham: A Research Study

خطۂ بلادِ شام کے نمایاں شہروں کی تاریخی، جغرافیائی اور تمدنی اہمیت: تحقیقی مطالعہ

Razia Sultana
PhD Research Scholar (Islamic Studies), NCBA&E Lahore, Multan Campus
razia.sultana2480@gmail.com

Dr. Hafiz Muhammad Arshad Habib
Assistant Professor of Islamic Studies, NCBA&E Lahore, Multan Campus
arshadhabib12@gmail.com

Abstract:
The prominent cities of the Levant have long been recognized as historical, geographical, and cultural centers of the Middle East. Damascus is one of the oldest continuously inhabited cities in the world, having been under Roman, Byzantine, and Islamic rule, and it became a major center for Islamic sciences, arts, and culture. Aleppo gained fame for its commercial and military significance, strategically located between the Euphrates River and the Mediterranean, making it a crossroads for trade routes. Homs, situated in central Syria, served as both a military and commercial hub due to its position connecting northern and southern regions, while its Islamic architecture and historical sites reflect the city's rich cultural heritage. Tartus, located on the Mediterranean coast, was an important port city used as a military center during the Crusader era, and its ancient fortifications and port structures highlight its historical and strategic importance. The cities of Jordan historically lay at the crossroads of trade routes, with their archaeological sites, forts, and towns enhancing their significance, while Lebanese cities were renowned as Mediterranean trade hubs, with ancient forts, markets, and religious buildings reflecting their cultural and economic importance. Overall, the cities of the Levant have not only played a crucial role in regional politics and economy but have also contributed significantly to the development of Islamic and Arab culture. Their ancient buildings, forts, mosques, and markets provide a vivid illustration of their historical, geographical, and cultural significance.

Keywords:
Levant, Damascus, Aleppo, Homs, Tartus, historical significance, Geographical importance, Cultural heritage, Trade center

بلادِ شام مشرقِ وسطیٰ کا ایک نہایت اہم تاریخی اور تہذیبی خطہ رہا ہے جس نے مختلف ادوار میں سیاسی، مذہبی اور معاشرتی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس خطے میں موجود بڑے شہر جیسے دمشق، حلب، حمص، حماہ اور بیت المقدس صدیوں سے تمدن، علم اور تجارت کے نمایاں مراکز کے طور پر جانے جاتے رہے ہیں۔ ان شہروں کی جغرافیائی اہمیت اور ثقافتی وسعت نے انہیں نہ صرف علاقائی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک خاص مقام عطا کیا۔ قدیم زمانے سے یہ شہر مختلف اقوام، مذاہب اور تہذیبوں کے ملاپ کا مرکز رہے، جس کے نتیجے میں یہاں ایک متنوع اور ہمہ گیر تمدنی ماحول تشکیل پایا۔

دمشق کو بلادِ شام کا سب سے قدیم اور باوقار شہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی قدامت، خوبصورتی اور علمی روایت کے باعث ہمیشہ سے مرکزِ توجہ رہا ہے۔ اسلامی دور میں خصوصاً اموی خلافت کے قیام کے بعد دمشق کو دارالخلافہ کی حیثیت

حاصل ہوئی جس سے اس کی سیاسی اور تمدنی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ یہاں مساجد، مدارس اور علمی مجالس نے علم و فکر کی روایت کو فروغ دیا اور یہ شہر اسلامی تہذیب کا ایک روشن مینار بن گیا۔

اسی طرح حلب تجارتی سرگرمیوں کے حوالے سے نہایت اہم شہر تھا۔ یہ شہر قدیم تجارتی راستوں پر واقع ہونے کے باعث مشرق و مغرب کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتا رہا۔ اس کے بازاروں، قافلوں اور تجارتی مراکز نے نہ صرف معیشت کو مضبوط کیا بلکہ ثقافتی روابط کو بھی فروغ دیا۔ حمص اور حماہ اپنی زرعی پیداوار اور جغرافیائی محلِ وقوع کی بدولت علاقائی معاشی نظام میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ ان شہروں کی زرخیز زمینیں اور دریاؤں کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے یہاں خوشحالی اور استحکام کی فضا قائم رہی۔

بیت المقدس کو مذہبی اور روحانی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یکساں تقدس کا حامل رہا ہے۔ اسلامی عہد میں اس شہر کی مذہبی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا اور یہ عبادت، علم اور روحانیت کا ایک نمایاں مرکز بن گیا۔ اس طرح بلادِ شام کے بڑے شہر تاریخ کے مختلف ادوار میں تہذیب، سیاست، معیشت اور مذہب کے اہم مراکز کے طور پر ابھرتے رہے اور انہوں نے انسانی تمدن کی تشکیل میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

نتیجتاً بلاد شام مشرقِ وسطیٰ کا ایک قدیم اور تاریخی خطہ ہے جس میں شام، لبنان، اردن اور فلسطین شامل ہیں۔ اس میں موجود تمام شہر اپنی خاصیت کے لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر شہر اپنی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خطہ اپنی تہذیب، تاریخ، علم، تجارت اور ثقافت کی وجہ سے صدیوں سے دنیا کی توجہ کا نقطہ نگاہ رہا ہے۔ بلاد شام کے بڑے شہر نہ صرف سیاسی و معاشی اہمیت رکھتے ہیں۔ بلکہ دینی اور ثقافتی اعتبار سے بھی نمایاں ہیں۔

ا۔ دمشق

اس زمانے میں شام کا سب سے بڑا شہر دمشق تھا۔ اس کے بانی " دمشاق بن کنعان " کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔ مصر کے اٹھارویں خاندان کے حکومت کے زمانے میں دمشق پر مصر حاکم ہو گیا۔ یہ ایک پرانا تاریخی شہر تھا۔ شروع کے دور میں بت پرستی کا یہ بہت بڑا مرکز تھا۔ مگر مسیحیت کے کے آنے سے اس کے بت کدے کلیسا بنا دیے گئے۔ انطاکیہ کے کلیسا کے علاوہ کوئی کلیسا اپنی خوبصرتی میں اس کلیسا کا ہمسر نہ تھا۔

دمشق کا محلِ وقوع

محلِ وقوع کے اعتبار سے دمشق کے جنوب میں "بلقاء" کی سرسبز زمینیں ہیں۔ "جولان" کی پہاڑیاں شمال میں تھیں جن کے درمیان سرسبز و شاداب، لہلہاتے کھیت، اور کانوں میں رس گھولتے چشمے اور آبشاریں تھیں۔ تجارت کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس علاقے میں عرب آباد تھے۔ مسلمان اپنے تجارتی قافلے یہاں لاتے تھے۔ اور یہاں سے معلومات حاصل کرتے تھے۔ دمشق کی حفاظت اور مضبوطی کے لیے اس کے اطراف میں فصیل بنائی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اسے انفرادی مقام حاصل تھا۔ فصیل کو بڑے بڑے پتھروں سے بنایا گیا تھا جس کی بلندی چھ میٹر تھی۔ اس میں تین میٹر چوڑائی کے بہت مضبوط دروازے لگائے گئے تھے۔ تین میٹر چوڑی خندق دمشق کی فصیل کے اطراف میں تھیاس خندق کو ہمیشی دریائے بروی کے پانی سے بھر کر رکھتے تھے۔ خندق کی وجہ سے دمشق میں داخل ہونا ناممکن تھا۔[1]

پہلے شام کا صدر مقام دمشق شہر تھا۔ یہ شہر زمانہ جاہلیت میں عربوں کے لیے تجارت کا مرکز تھا۔ اس لیے تمام عرب میں بہت شہرت رکھتا تھا۔[۲] یہ دنیا کا واحد پرانا شہر تھا جو زمانے کی گردش سے محفوظ رہا۔ اس شہر میں باغات ہیں جن کو چشموں سے سیر اب کیا جاتا۔ مشرقی سلسلے میں لبنان کے پہاڑ ہیں۔ شمال کی طرف بردی ندی آباناہے۔ شہر کے بالکل درمیان میں بنوامیہ کی جامع مسجد امویہ ہے۔ یہ اپنی خوبصورتی میں میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے قریب ہی "الخضرا" نام کا خلیفہ کا محل ہے۔[۳]

دمشق میں بہت اہمیت کی حامل تعمیر "جامع اموی یا جامع دمشق" ہے اس دور کا بلکہ ولید بن عبد الملک کے زمانے کی یہ بڑا کام سمجھی جاتی تھی۔ جامع دمشق کی تعمیر پر بے بہا روپیہ پیسہ خرچ ہوا۔ سات سال کا ملک شام کا خراج خرچ ہوا۔ ہندوستان، فارس، مغرب اور روم سے ہنر مند اور تعمیری سامان اس مسجد کے لیے منگوایا گیا۔ اٹھارہ جہازوں پر صرف سونا اور چاندی جزیرہ قبرص سے آیا۔ مشہور مقامات سے قیمتی پتھر منگوایا گیا۔[۴] نو سالوں میں بارہ ہزار مزدوروں نے مل کر یہ مسجد تیار کی۔ اس میں ایک وقت میں بیس ہزار آدمی نماز ادا کر سکتے تھے۔ اس کی محرابوں میں بہت قیمتی جواہرات لگائے گئے تھے۔ دیواروں اور دروازوں پر سونے اور لاجوردی کا کام تھا۔ سونے کی زنجیروں میں صرف چھ سو قندیلیں لٹکائی گئی تھی۔ یہ اس وقت دنیا کی بڑی عمارتوں میں پانچویں نمبر پر تھی۔ اس کا شمار اس وقت کے عجائبات میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے دور اقتدار میں اس کے جواہرات کو بیچ کر بیت المال میں جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ روم کے قاصد عین اسی دور میں آئے ہوئے تھے جیسے ہی انہوں نے جامع مسجد کو دیکھا تو کہا کہ ہمارا خیال تھا کہ مسلمان چند دن کا عروج پائیں گے مگر اس مسجد کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ "مسلمان زندہ رہنے والی قوم ہے" حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس بات کو سنتے ہی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔[۵] ۸۵۴ء میں دمشق میں معتصم کے بیٹے متوکل کے دورِ حکومت میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ۸۵۸ء میں متوکل نے حکومت کا مرکز دمشق میں منتقل کیا۔[۶] دمشق کے دارالحکومت نوریہ کے شروع کے اساتذہ میں ابن عساکر بھی تھے۔ ان کی کتاب "التاریخ الکبیر" ہے جس میں دمشق سے وابسطہ شخصیات کے سوانح لکھی ہے اور یہ اسّی جلدوں پر مشتمل کتاب ہے۔[۷]

دمشق کی تاریخی اہمیت

دمشق دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق اس شہر کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اور مختلف ادوار میں یہ کئی بڑی تہذیبوں اور سلطنتوں کا مرکز رہا۔ قدیم زمانے میں آرامی، آشوری، بابلی، فارسی، یونانی اور رومی حکومتوں نے اس شہر پر حکمرانی کی۔ ان مختلف تہذیبوں کے اثرات نے دمشق کو ایک قدیم تاریخی اور تہذیبی مرکز بنا دیا۔[۸]

اسلامی تاریخ میں دمشق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۴ھ میں مسلمانوں نے اسے فتح کیا اور اموی دورِ خلافت ۴۱ھ کے قیام کے بعد اسے اسلامی سلطنت کا دارالحکومت بنایا گیا۔ اموی دور میں دمشق سیاسی، علمی اور تہذیبی ترقی کا مرکز بن گیا۔ اور اسی زمانے میں اموی جامع مسجد کی تعمیر ہوئی جو اسلامی تعمیر کا نمونہ ہے اور صدیوں تک دینی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز رہی۔ اموی دور کے بعد بھی دمشق اسلامی دنیا میں علمی اور سیاسی اہمیت کا حامل رہا۔[۹]

دمشق کی جغرافیائی اہمیت

دمشق شام کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے اور جبل قاسیون کے دامن میں آباد ہے۔اس شہر کے قریب سے دریائے بردیٰ گزرتا ہے جس کے پانی سے اردگرد کے علاقے جن میں خاص طور پر غوطہ کے باغات سیر اب ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے دمشق قدیم زمانے سر سبز اور زرعی طور پر خوش حال علاقہ رہا۔[۱۰] جغرافیائی اعتبار سے دمشق کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ رہی ہے کہ یہ قدیم تجارتی شاہراہوں کے سنگم پر واقع تھا۔ ایشیاء، عرب اور بحیرہ عرب کے درمیان تجارت کرنے والے قافلے اکثر یہاں سے گزرتے تھے۔ علاوہ ازیں دمشق سے حجاز کی طرف جانے والا مشہور درب الحج الشامی بھی گزرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی تجارتی اور مذہبی اہمیت میں اضافہ ہوا۔[۱۱]

دمشق کی تمدنی اہمیت

دمشق قدیم زمانے سے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں عرب، آرامی، یونانی اور رومی ثقافتوں کے اثرات ایک دوسرے سے مل کر ایک منفرد تمدن کو پروان چڑھاتے ہیں۔اسلامی دور میں یہ شہر علم، ادب، فنِ تعمیر اور صنعت کا اہم مرکز بن گیا۔ دورِ اموی میں دمشق میں مساجد، مدارس، بازار اور شاندار عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ دمشق کی صنعتوں میں تلواریں، عمدہ ریشمی کپڑے اور شیشہ سازی مشہور تھی۔ یہ مصنوعات دور دور تک بر آمد کی جاتی تھیں۔ علمی اعتبار سے بھی دمشق ایک اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں بہت سے محدثین اور فقہا نے قیام کیا اور مدارس و کتب خانوں کے ذریعے علم روایت کو فروغ ملا۔[۱۲]

۲۔ حمص

شام کے پرانے اور مرکزی شہروں میں حمص کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے یہ شہر شام کے درمیان میں واقع ہے بلکہ اسے اسلام سے پہلے، دورِ نبوی، دورِ خلافتِ راشدہ، اموی، عباسی اور عثمانی دور میں ایک واضح مرتبہ رکھتا ہے۔ تاریخِ اسلام میں حمص کو فوجی، انتظامی اور علمی مراکز میں شامل کیا جاتا ہے۔

حمص کا جغرافیہ

دریائے عاصی (Orontes) کے کنارے افامیا کے جنوب میں حمص واقع ہے۔ یہ شہر کا درمیانی علاقہ ہے۔ دمشق سے شام کی طرف واقع ہے، ساحلی شام (طرابلس، لاذقیہ) اور اندرونی شام کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک زرخیز میدانی خطہ ہے اور اس کی آب و ہوا بہت معتدل ہوتی ہے۔ یہ فوجی اور تجارتی راستوں کا ملاپ ہے۔ حمص کے محلِ وقوع کے متعلق ابنِ حوقل لکھتے ہیں کہ " حمص ایک مضبوط اور خوشحال شہر بلادِ شام کے مرکز میں واقع ہے۔ اس کے ہر طرف زرخیز زمینیں ہیں اور یہ اہم شاہراہ پر واقع ہے۔"[۱۳]

حمص کا تاریخی پس منظر و اہمیت

قبل از اسلام حمص کو ایمیسا (Emesa) کہا جاتا تھا۔ حمص ایک اہم مذہبی اور سیاسی مرکز رومی اور بازنطینی دور میں تھا۔ اس شہر میں سورج کے معبد اور قلعہ بند شہر موجود تھے۔ یہ رومی سلطنت کا ایک اہم شہر تھا۔ اس کے حکمران مقامی عرب خاندان (آلِ امیسہ) تھے یہ ایک پائیدار قلعہ ہونے کی وجہ سے عسکری حیثیت رکھتا تھا۔ یاقوت حموی کے مطابق " حمص ایک پرانا شہر ہے۔ اسے روم والے امیسا کہتے تھے۔ قلعہ اور مضبوط فصیلوں کی وجہ سے یہ شہر بہت مشہور تھا۔"[۱۴] یہاں

پر رومیوں کے دور میں پر ہتوں نے حکومت کی۔ مگر بعض ایسے بھی علاقے تھے جن کی بھاگ ڈور مقامی امراء کے ہاتھ میں تھی۔ جن میں دمشق، تدمیر اور ادیسا وغیرہ شامل ہیں۔ ہر شہر ایک چھوٹی ریاست کا محور تھا، حمص کے امراء بھی تدمر اور ایک عرصہ تک دمشق کے امراء کی طرح امراءئے شہنشاہت میں شامل رہے۔ اور ان کو ملک کے انتظامات چلانے میں شامل کر لیا گیا۔ شام کے دولوگوں نے بہت بعد میں شاہی تخت پر قبضہ کر لیا۔ ایک آدمی حمص کے شاہی خاندان کا بانی تھا۔ اس نے سیمپسی جریمس کا لاطینی نار کھ لیا۔ ڈومیٹین نے اس کے اخلاف کو بادشاہت سے نکال دیا۔ لیکن دلیرین کے زمانے میں اس خاندان کی لڑی پھر ظاہر ہو گئی۔ ایسے ہی ۲۵۸ء میں حمص کا ایک لشکر پارتھیوں سے لڑا۔ اس سے پہلے مختلف مواقع پر ادیسا کے ابجر اور تدمر کے بادشاہ لڑائی کر چکے تھے۔ حمص میں بعل کے معبد کو ایک انوکھا کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک پروہت نوجون جس کا لقب بیسیانوس، ایلاگیبیلوس تھا قیصر کے تخت کا مالک بن گیا۔ حمص کی دیوی کا یہ نام تھا۔[۱۵] خلافتِ راشدہ کے دور میں حمص کو حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی سربراہی میں فتح کیا۔ حمص کی فتح صلح کے ذریعے طے پائی۔ جس میں شہر والوں کو جان مال اور ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ دیا گیا۔ حمص کو جند حمص کا مرکز بنایا گیا۔ وہاں پر مستقل فوجی چھانیاں قائم کیں۔ اور اسلامی عدالتی اور انتظامی نظام نافذ کیا گیا۔ اہلِ حمص نے مسلمانوں سے صلح کی۔ اور ان کے اموال، جانوں، اور گرجاگھروں کو امان دی گئی۔[۱۶]

حمص کی جغرافیائی اہمیت

حمص عثمانی دور میں ایک صوبائی شہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہر کی معاشی حالت اس دور میں مستحکم رہی۔ اور تجارتی سرگرمیوں کو فروغ ملا۔ عثمانی دور میں حمص میں گورنروں کو عہدے دیے گئے۔ شہر پناہ اور قلعوں کی مرمت کی گئی۔ زراعت اور تجارت میں ترقی ہوئی۔ علامہ شبلی نعمانی کے مطابق حمص دمشق جیسا بڑا شہر نہیں مگر اپنی شہرت، بازاروں اور علمی ترقی کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔[۱۷] زرخیز میدانوں اور آبپاشی کے نظام کی وجہ سے یہاں گندم، کپاس،، مکئی اور دیگر زرعی اجناس کی پیداوار ہوتی رہی۔[۱۸]

حمص کی تمدنی اور ثقافتی اہمیت

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حمص ایک اہم فوجی اور انتظامی شہر بن گیا۔ مگر دور اموی میں اگرچہ دمشق دار الحکومت تھا۔ اس کے باوجود حمص ایک مضبوط عسکری مرکز رہا۔ یہاں پر علمی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہ شہر فوجی اور سرحدی تحفظ کے لیے بہت اہم رہا۔[۱۹] تاریخِ اسلامی میں حمص شہر بہت سے صحابہ کرام اور تابعین کا مسکن رہا۔ ان میں سے حضرت خالد بن ولیدؓ نے حمص میں قیام فرمایا، اپنے آخری ایام بھی وہیں گزارے اور حمص میں ہی مدفون ہیں۔ حضرت ابو درداؓ نے بھی حمص میں قیام کیا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے بھی حمص میں قیام فرمایا۔ حمص میں باقاعدہ حدیث اور فقہ کے حلقے قائم کیے گئے۔ مساجد اور مدارس کی بہت بڑی تعداد تعمیر کی گئی۔ علامہ ذہبی کے مطابق " صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد حمص میں مقیم رہتی تھی اور وہاں علمِ حدیث کی اشاعت ہوتی تھی۔[۲۰] الغرض حمص شام کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے جو اپنی مرکزی، جغرافیائی حیثیت، قدیم تاریخی پسِ منظر اور متنوع تمدنی ورثے کی وجہ سے ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر سیاسی، عسکری، معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں کا اہم مرکز رہا ہے۔

۳۔اُردن

اُردو کی تاریخی اہمیت

قدیم بلادِ شام میں اردن کا خطہ شامل ہے۔ تاریخ میں اردن کبھی ایک علاقہ اور کبھی مکمل طور پر مستقل حیثیت کے طور پر مانا جاتا تھا۔ اردن کا شمار بلادِ شام کے پانچ جند میں ہوتا تھا۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں قدیم پتھر کے زمانے سے انسان آباد تھے۔ اسلام سے پہلے یہاں نبطی، رومی اور بازنطینی تہذیبوں کا اثر رہا۔[۲۱] جب شام روم کے زیر سلطنت آگیا تو اردن بھی اس نظام مملکت میں شامل ہو گیا۔ رومی دور میں اردن کے کئی شہروں نے بہت ترقی کی۔ جرش اور عمان ان میں نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ اُردن میں رومیوں نے سڑکیں، قلعے اور شہری منصوبہ بندی متعارف کروائی۔[۲۲]

بیز نطینی دور میں اردن کلیسائیت کا اہم مرکز بن گیا۔ اس دور میں اردن میں گرجاگھروں خانقاہوں اور مذہبی تعلیمی مراکز کا قیام عمل میں آیا۔ عیسائیت مذہبی اور سماجی نظام کا محور بن گئی۔ اسی دور میں اردن شام کے دوسرے علاقوں کے ساتھ مل کر کلیسائی نظام کا حصہ بنا۔[۲۳] مسلمانوں نے جب شام کو فتح کیا تو اردن کو ایک مستقل انتظامی صوبہ جسے "جند الاردن" کہا گیا۔ شرجیل بن حسنی نے حضرت عمرؓ کے دور میں اسے طاقت سے فتح کیا تھا۔ طبریہ اس صوبے کا دارالحکومت قائم ہوا۔[۲۴] اس کے دورِ حضرت عمرؓ میں اس کی حدود متعین کی گئیں۔ اور یہاں عدالتی اور مالی نظام نافذ کیا گیا۔ غیر مسلم آبادی کو مذہبی آزادی دی گئی۔[۲۵] اس نے ہر دور میں اپنا ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اردن کی فوجی چھاؤنی "طبریہ" میں تھی۔ شرجیل بن حسنہؓ اس کے ابتدائی ذمہ دار تھے۔ یزید بن ابی سفیانؓ ان کے بعد اور پھر معاویہؓ ذمہ دار مقرر ہوئے۔ جب یزید بن ابی سفیان کی طاعون عمواس میں ابی سفیان کی وفات ہوئی تو اس کے بعد دمشق اور اردن کی فوجی ذمہ داری بھی معاویہؓ نے سنبھال لی۔[۲۶]

اُردن کی جغرافیائی اہمیت

محلِ وقوع کے اعتبار سے یہ دریائے اردن کے مشرق میں مغربی ایشیا میں واقع تھا۔ یہ فلسطین کے اور دمشق کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا۔ اس علاقے میں زرخیز میدان، پہاڑی سلسلے اور تجارتی راستے پائے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے اسے معاشی اور عسکری اہمیت حاصل تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ علاقہ قدیم اقوام کی رہائش، رومی اور بیز نطینی اثرات اور بعد میں اسلامی نظام حکومت کی وجہ سے مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔[۲۷] اردن کی جغرافیائی ساخت تین بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔

صحرائی علاقہ جو شام اور عرب کے صحرا کا حصہ ہے۔

اردن کے مشرقی بلند پہاڑی علاقے جو وادی اردن کے مشرق میں واقع ہے۔

وادی اُردن جو عظیم رِفٹ ویلی کا حصہ ہے۔ بحیرہ مردار یہاں سے گزرتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے نچلا مقام ہے۔[۲۸]

اُردن کی تمدنی اہمیت

اسلام سے پہلے اس خطے میں کنعانی، عمونی، اور موآبی اقوام آباد تھیں۔ ان اقوام کا تعلق سامی اقوام سے تھا۔ زراعت، مویشی، گلہ بانی اور تجارت پر ان لوگوں کی معیشت کا انحصار تھا۔ مذہبی طور پر یہ اقوام مشرکانہ عقائد رکھتی تھیں۔ دمشق اور فلسطین کے ساتھ ان کے روابط سماجی اور تہذیبی تھے۔[۲۹] اردن سمیت شام کے تمام اجناد تہذیبی اعتبار سے ایک

ہی تھے۔ رومی، کلیسائی اور اسلامی اثرات کا امتزاج اُردن کی پہچان بن گیا۔ اسی وجہ سے بلادِ شام کے دیگر علاقوں سے اسے علیٰحدہ کرتا ہے۔[۳۰] انھی اصولوں کی وجہ سے اُردن میں اسلامی حکومت کو قبول کیا گیا۔ دور اموی میں اُردن براہ راست دمشق کے زیر انتظام آگیا۔ اس دور میں زراعت، تجارت اور شاہراہوں کی تعمیر میں ترقی ہوئی۔ اموی ریاست کے معاشی نظام میں اردن ایک معاون خطے کی حیثیت رکھتا تھا۔[۳۱] اُردن بلاد شام کا جند ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی سماجی اور تمدنی اہمیت کا حامل بھی ہے۔

۴۔ لبنان

قدیم زمانے سے ہی لبنان بلادِ شام کا ایک اہم اور ضروری حصہ رہا ہے۔ بلادِ شام میں لبنان اس وحدت کا ساحلی حصہ تھا۔ اس خطہ نے شام کے اندرونی علاقوں کو بحیرہ روم سے جوڑنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یاقوت الحموی کے مطابق "ساحلی شام کے تمام شہر چاہے وہ صور، صیدا ہوں یا بیروت، شام کے ہی تاریخی اور تمدنی دائرے میں گنے جاتے ہیں۔[۳۲]

لبنان کی تاریخی اہمیت

لبنان مشرقِ وسطی کے قدیم ترین علاقوں میں سے ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ متعدد تہذیبوں کا مرکز رہا۔ لبنان میں فینقی تہذیب پروان چڑھی۔ فینقی باشندوں نے بحیرہ روم کے ساحلوں پر تجارتی بستیاں قائم کیں۔ بعد میں لبنان پر آشیریوں بابلیوں، یونانیوں اور رومیوں نے حکومت کی۔ رومی دور میں لبنان کے شہر بعلبک اور صور مذہبی اور تجارتی مرکز بن گئے۔[۳۳] لبنان کی تاریخ میں رومی دور غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصا بیروت کے حوالے سے رومیوں نے بیروت کو قانون کی اعلی تعلیم کا مرکز بنایا۔ اور یہاں قائم Law School پوری رومی سلطنت میں شہرت رکھتی تھی۔ رومی قانوں کے بڑے بڑے ماہرین بیروت میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے اس شہر کو علمی اعتبار سے نمایاں مقام حاصل ہوا۔ جرجی زیدان کے مطابق: کہ بیروت کو رومی قانوں کا دماغ کہا جاتا تھا۔[۳۴] چوتھی صدی عیسوی میں جب عیسائیت کو سرکاری مذہب کا درجہ ملا تو لبنان خاص طور پر اس کے پہاڑی علاقے عیسائی مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ لبنان میں بڑی تعداد میں گرجاگھر اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔ اسی دور میں مارونی عیسائی فرقہ لبنان میں مضبوط ہوا۔ لبنان کی یہی مذہبی ساخت بعد کے ادوار میں بھی اس کی سیاسی اور سماجی تاریخ پر اثر انداز ہوتی رہی۔[۳۵] اسلامی فتوحات کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں لبنان بلادِ اسلام میں شام ہوگیا۔ یرموک کی فیصلہ کن فتح کے بعد شام کے ساحلی علاقوں کی تنظیم حضرت ابوعبیدہ الجراحؓ اور بعد میں حضرت معاویہؓ نے کی۔ بیروت اسلامی ریاست کا ایک دفائی اور بحری مرکز بن گیا۔ اسلامی دور میں لبنان کے عیسائی باشندوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ اور ان کے گرجاگھر محفوظ رہے۔ جس سے علاقے میں سماجی استحکام پیدا ہوا۔[۳۶] لبنان کی عسکری اہمیت میں عباسی دور میں مزید اضافہ ہوا۔ کیونکہ یہ بیزنطینی سرحد کے قریب تھا۔ ساحلی شہروں میں قلعے تعمیر کیے گئے۔ اس دنیا میں لبنان اسلامی دنیا کے دفائی نظام کا ایک جز بن چکا تھا۔[۳۷] صلیبی جنگوں کے دوران لبنان کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ صلیبیوں نے بیروت، صوراور صیدا پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کو اپنی ریاست کا حصہ بنالیا۔ صلاح الدین ایوبی اور بعد کے بادشاہوں نے ان کو صلیبیوں کے قبضہ سے آزاد کروالیا۔ ان حالات نے لبنان کی آبادی، معیشت پر گہرے اثرات چھوڑے۔[۳۸] عثمانی دور میں بھی لبنان کو ایک مخصوص خود مختاری حاصل رہی۔ امیر فخر الدین معن ثانی نے لبنان کو سیاسی اور

معاشی استحکام فراہم کیا۔ اور بیروت کو ایک اہم تجارتی بندر گاہ میں تبدیل کر دیا۔ لبنان عثمانی دور میں یورپ اور مشرقِ وسطیٰ درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر گیا۔[۳۹]

لبنان کی جغرافیائی اہمیت

بلادِ شام سے لبنان کا جغرافیہ اسے ممتاز بناتا ہے۔ لبنان پہنچ کر مغربی پہاڑی سلسلہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ یہ نہر الکبیر سے قاسمیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ صور کے شمال میں ہے۔ لبنان لفظ کی اصل سامی ہے۔ "لابن" جس کے معنیٰ "سفید" ہیں لبنان کے پہاڑوں پر برف جمع رہنے کی وجہ سے اس کا نام لبنان ہو گیا۔ "القریۃ السوداء" لبنان کی سب سے بلند پہاڑی ہے۔ اس کے قریب ہی "ضہر القضیب" ہے۔[۴۰] لبنان کے ایک طرف سطح مرتفع ان کے سامنے سمندر ہے۔ اس کا عمومارنگ گہرا نیلا ہوتا ہے۔ فلسطین میں دور تک لبنان کا ساحلی میدان ہے۔ شام کا مغربی پہاڑی سلسلہ جلیل کی بالائی پہاڑیوں سے ہوتا ہے یہ لبنان اور جلیل زیریں کے کے سلسلے سے فاصلے پر واقع ہے۔ سطح مرتفع اور نہر بردی نے مشرقی لبنان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شمالی اور دوسرا جنوبی، مشرقی لبنان کی آبادی مغربی لبنان سے زیادہ ہے۔ حالیہ جمہوریہ لبنان کی سرحد کوہ حرمون سے گزر کر زبدان تک پہنچتی ہے۔[۴۱]

لبنان کی تہذیبی و ثقافتی اہمت

لبنان کی بہت پرانی تہذیب فینیقی تہذیب تھی جس کا تعلق در اصل کنعانی اقوام سے تھا۔ موجودہ لبنان ہی فینیقوں کا مرکز تھا۔ اپنی تجارتی کالونیاں یہاں سے انہوں نے بحیرہ عرب کے طول و عرض میں بنائیں۔ صور، صیدا اور بیروت فینیقی شہروں میں شمار ہوتے تھے۔[۴۲] ۳۳۲ قبل مسیح میں سکندرِ اعظم کی فتوحات کے بعد یونانی اثر ورسوخ میں لبنان آ گیا۔ یونانی دور میں بیروت کو "بیروتوس" کہا جانے لگا۔ اور یہاں یونانی زبان، فلسفہ اور شہری منصوبہ بندی متعارف ہوئی۔ تاہم فینیقی ورثہ مکمل طور پر ختم نہ ہو سکا۔ بلکہ یونانی تہذیب کے ساتھ امتزاجی صورتحال اختیار کر گیا۔ فلپ حتی کے مطابق لبنان، یونانی دور میں ایک ایسا خطہ تھا جہاں مقامی اور یونانی ثقافتیں باہم مدغم ہو گئیں۔[۴۳]

لبنان اپنی تاریخی اور جغرافیائی محلِ وقوع اور ثقافتی تنوع کے باعث مشرقِ وسطیٰ کے اہم ترین خطوں میں شمار ہوتا ہے۔ قدیم فینقی تہذیب سے لے کر جدید دور تک یہ خطہ مختلف تہذیبوں اور طاقتوں کا مرکز رہا۔ اس کے ساحلی محلِ وقوع نے تجارت کو فروغ دیا۔ اسی وجہ سے لبنان کو تاریخ، جغرافیہ اور تمدن کے حوالے سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

۵۔ حلب

شام کے قدیم ترین تاریخی شہروں میں حلب کا شمار ہوتا ہے۔ حلب شہر کو حلب ابراہیم بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے اسی شہر میں پرورش پائی۔ آپؑ گلہ بانی کرتے تھے۔ غریبوں اور مسافروں کو ان بکریوں کا دودھ پلاتے تھے۔ آپؑ کے اس کام کی اتنی شہرت ہوئی کہ لوگ گروہ در گروہ آ کر پوچھتے کہ حلب ابراہیم کہاں تقسیم ہوتا ہے اسی لیے یہ شہر حلب ابراہیم کے نام سے مشہور ہو گیا۔[۴۴]

حلب کی تاریخی اہمیت

اسے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں واضح مقام حاصل ہے۔ یہ شہر اپنی قدیم تاریخ بلکہ مسلسل آباد رہنے کے باعث بھی دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آثارِ قدیمہ، قدیم مشرقی متون اور اسلامی تاریخی مصادر بھی اس بات کے گواہ

ہیں۔ اہمیت کے اعتبار سے حلب پورے شمالی شام کی سیاسی، عسکری، معاشی اور علمی زندگی کا محور رہا ہے۔ مختلف ادوار میں یہ شہر علاقائی سلطنتوں کا دارالحکومت رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہاں پر مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا امتزاج پیدا ہوا۔ قدیم تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے شواہد کے مطابق حلب کا قدیم نام "حلپا" (Halpa) تھا۔ جس کا ذکر اموری اور حتیٰ متون میں ملتا ہے۔ دو ہزار سال قبل یہ شہر اموری سلطنت کا اہم مرکز تھا۔ بعد میں حتیوں کے زیرِ اثر آ گیا۔ حلب اس لیے بھی مرکز مانا جاتا تھا کیونکہ یہاں طوفان کے دیوتا "حداد" کا عظیم مندر قائم تھا۔ جو پورے شمالی شام میں شہرت رکھتا تھا۔[۴۵] بیز نطینی دورِ حکومت کی وجہ سے اسے بہت ترقی ملی۔ عربوں نے اس پر ساتویں صدی میں قبضہ کر لیا تھا۔ پھر بیز نطینیوں کے قبضہ میں دسویں صدی ہجری میں چلا گیا تھا۔ سلجوکی ترکوں نے اس پر پھر گیارویں صدی کے آخر میں قبضہ کر لیا تھا۔ صلیبیوں نے ۱۱۲۴ء میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء میں اس پر پھر قبضہ کر لیا۔ ہلاکو خان نے ۱۲۶۰ء میں اور امیر تیمور نے ۱۴۰۱ء میں قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد عثمانی ترکوں نے ۱۵۱۷ء میں قبضہ میں لے لیا۔ اس کے چند سال بعد مصر کا بھی قبضہ رہا۔[۴۶]

حلب کی جغرافیائی اہمیت

شام کے شمالی حصے میں سطح مرتفع پر حلب واقع ہے۔ جغرافیائی طور پر اناطولیہ (موجودہ ترکی)، عراق (میسوپوٹیمیا) اور ساحلی شام کے درمیان ایک قدرتی سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی محلِ وقوع کی وجہ سے یہ قدیم تجارتی شاہراؤں کی گزر گاہ ہے۔ حلب سے شاہراہ ریشم کی شاخیں گزرتی ہیں۔ جن کے ذریعے چین، وسطی ایشیا اور ایران سے آنے والا سامان بحیرہ روم تک پہنچتا تھا۔ شہر کے آس پاس زرخیز میدان، مناسب بارش اور زیرِ زمین آبی وسائل کی وجہ سے زراعت کو فروغ ملا۔ اس وجہ سے حلب کی معاشی بنیاد مستحکم ہوئی۔ یہی جغرافیائی فوائد بعد کے ادوار میں عسکری لحاظ سے بھی اہم ثابت ہوئے۔ کیونکہ حلب شمالی شام کے دفائی نظام کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔

حلب کی تمدنی اہمیت

ماضی میں یہ شہر ریشم اور مصالحہ جات کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ آرامیوں کے دور میں حلب سیاسی مرکز کے طور پر ابھرا۔ جبکہ یونانی اور رومی ادوار میں اسے صوبہ شام کے ایک اہم شہر کی حیثیت حاصل رہی۔ رومی دور میں شہری منصوبہ بندی، سڑکوں کے نظام میں بہت ترقی ہوئی۔ اس کے اثرات بعد کے ادوار تک برقرار رہے۔[۴۷] دورِ اسلامی میں اسلامی فتوحات کے دوران ۱۶ھ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں حلب مسلمانوں کے زیر قیادت آ گیا۔ حلب میں مدارس، خانقاہیں، حمام، کاروان سرائے اور محلات اسلامی شہری تمدن کی ترقی اور سماجی زندگی کی مضبوطی کا ثبوت ہیں۔[۴۸]

حلب اپنی جغرافیائی محلِ وقوع اور متنوع تہذیبی ورثے کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ کے اہم ترین تاریخی شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شہر صدیوں تک تجارتی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور مختلف تہذیبوں کے ملاپ نے اسے ایک منفرد تمدنی شناخت عطا کی۔

۶۔ طرطوس

طرطوس شہر بڑا وسیع اور بہت شہرت رکھتا ہے۔ اس کے ارد گرد پتھر کی فصیل بنائی گئی ہے۔ عسکری اعتبار سے بہت شہرت رکھتا ہے۔ یہاں پر پانی کی بہتات ہے۔ اس شہر کو عمدہ طریقہ سے بنایا گیا ہے۔ یہاں پر بہت زیادہ اجناس پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں میں بہت زیادہ فہم و فراست رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔

تاریخی اہمیت

رومی دور میں شہنشاہ قسطنطین اوّل نے ۳۴۶ء میں اس شہر کی تعمیر کروائی جس کے بعد یہ رومی اور بازنطینی ادوار میں ایک اہم مرکز بن گیا۔ یہاں ہمہ وقت ایک لاکھ سوار تعینات رہتے تھے۔ طرطوس میں آکر لوگ فوجی بستیاں قائم کرتے تھے۔ لڑائی کرتے ہوئے شہید ہو جاتے تھے۔ یہاں سے کوئی فوجی بھی سلامت واپس نہیں جاتا تھا۔ بلاذری کے مطابق اسے خلیفہ المہدی اور ہارون الرشید نے نئے سرے سے بنوایا پھر اس میں قلعے اور چھاونیاں بنائی تھیں۔[۴۹] ادریسی کے مطابق اس میں مالِ تجارت کی کثرت پائی جاتی ہے۔ اس کی زمین بہت ذرخیز ہے۔ یاقوت کے مطابق طرطوس شام کی سرحد کے قلعوں میں سے ایک قلعہ ہے۔ یہاں پر مامون الرشید کا مقبرہ ہے۔ اس شہر کے چھ دروازے ہیں۔ اور خندق بہت وسیع ہے۔ یونانی بادشاہ نکفور نے سرحدی علاقے قلاع اور المصیصہ کو فتح کر کے طرطوس پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کو اس سے آزادی مل گئے اور وہ جہاں جانا چاہتے تھے چلے گئے۔ رہنے والوں نے جزیہ ادا کیا۔ نکفور نے قرآن کے تمام نسخوں کو جلا دیا۔ تمام اسلحہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یہ علاقہ کفار کے ہاتھ میں ہے۔[۵۰]

طرطوس کی جغرافیائی اہمیت

طرطوس شام کے مغربی ساحل پر واقع بحیرہ روم کے کنارے پر واقع ہے۔ اور اس کے سامنے جزیرہ ارواڈ واقع ہے۔ یہ شہر ساحلی میدان اور شام کے ساحلی پہاڑی سلسلے کے درمیان واقع ہے۔ یہ شام کی دوسری بڑی بندرگاہ ہے۔ جس کی وجہ سے ملک کی تجارتی سرگرمیوں میں بڑی مدد ملتی ہے۔[۵۱]

۷۔ فلسطین

بیت المقدس میں موجودہ قیام پذیر فلسطینی کنعانیوں کی اولاد ہیں۔ فلسطین کافی مرتبہ اجڑنے کے بعد آباد ہوتا رہا۔ بہت سے قبائل جن میں یبوسی اور عرب قبائل فلسطین میں ہی آباد رہے۔

فلسطین کی تاریخی اہمیت

تفسیرِ حقانی میں مولوی عبدالحق حقانیؒ نے لکھا ہے کہ شام کا پرانا نام کنعان ہے۔ کنعانیوں کی نسبت کنعان بن حام بن نوح سے ہے کسی زمانے میں بحیرہ روم کے کنارے تک شام کا مغربی حصہ پایا جاتا تھا۔ اس علاقے میں غزہ، عسقلان، یافا اور رملہ موجود تھے۔ یہ شہر تجارتی بندرگاہوں کے لیے استعمال ہوتے رہے۔ فلسطین کا رابطہ بحیرہ روم کے واسطے یورپ، شمالی افریقہ اور ایشیائی ساحلوں سے قائم تھا۔ اسی لیے فلسطین نہ صرف زمینی بلکہ بحری تجارتی نظام کا بھی حصہ رہا۔[۵۲] قبیلہ کوش کے عوام بھی پرانے زمانے میں اسی جگہ آباد تھے۔ حلب، حمص، بابل اور فلسطین بھی شام کی حدود میں واقع تھے۔[۵۳] حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کے نام کی مناسبت سے "شام" کا نام پڑا۔ عرب جب یہاں آباد ہوئے تو انہوں نے سام کو تبدیل کر کے شام رکھ دیا۔ چناچہ دورِ اسلام میں اسے شام ہی کہا جاتا رہا۔ کلبی کے مطابق شام کی مختلف جگہوں کی مٹی کسی جگہ پر سفید اور کسی جگہ پر کالی ہونے کی وجہ سے اسے شام کہا گیا۔[۵۴] جہاں پر کنعانی آباد ہوئے تھے اسی جگہ کا نام فلسطین رکھا گیا۔ سرزمینِ کنعان پر بنی اسرائیل نے تلوار سے حملہ کر کے کنعانیوں کو قتل کر دیا اور جو زندہ بچ گئے ان کو ملک سے نکال دیا۔ کچھ عرصہ بعد شام پر رومیوں نے حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا۔ باقی ماندہ کو عراق کی طرف نکال دیا۔[۵۵] حضرت ابراہیمؑ کے

والد محترم جب بابل سے ہجرت کر کے جب کنعان آئے تو وہاں ان کا وصال ہوا۔ اور وہ وہیں دفن ہیں جہاں آج بیت المقدس ہے۔ یہ اس وقت کشدانیوں کے سرزمین کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اسی کو آج فلسطین کی سرزمین کہا جاتا ہے۔[۵۶]

فلسطین کی جغرافیائی اہمیت

اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے فلسطین ایک اہم مرتبہ رکھتا ہے۔ دنیا کے دو بڑے برّاعظم ایسیاء اور افریقہ بحر روم / بحر ابیض کے جنوبی ساحل پر اکھٹے ہوتے ہیں۔ مشرق میں اردن واقع ہے یہاں پر سدوم کا شہر آباد تھا۔ شمال میں لبنان، شمال مشرق میں شام، جنوب میں مصر، بحر احمر اور صحرائے سینا کی حدود واقع ہیں۔ ملک عرب کے شمالی حصے جنوب میں واقع ہیں۔ شمالی حصہ مغرب میں واقع ہے۔ فلسطین تین برّاعظموں ایشیاء۔ افریقہ، یورپ اور دنیائے اسلام کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ "فلسطین" پرانے زمانے میں تجارتی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے مشہور تھا۔ فلسطین انبیاء کرام کی سرزمین ہونے کی وجہ سے بابرکت قرار پائی۔[۵۷] فلسطین میں حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کا مقام بیت اللحم، دیوارِ گریہ، ہیکلِ سلیمانی قبلہ اول اور قبۃ الصخراء رسولِ اللہ ﷺ جس جگہ سے معراج پر تشریف لے گئے۔ اور اسی پاک زمین پر مسجدِ اقصیٰ واقع ہے۔ اس مسجد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔[۵۸] چار مختلف حصوں میں فلسطین کی سرزمین تقسیم ہے۔ مشرق میں پہاڑ اور بحر ابیض اس کے مغرب کے درمیں واقع ہے۔ شمالی پہاڑی سلسلے میں فلسطین کی سب سے بلند پہاڑی "الجرمق" واقع ہے۔ "حیدر" پہاڑ دوسرے حصہ میں ہے۔ دریائے جلیل کی طرف پہاڑی سلسلہ لبن کہلاتا ہے۔ یہ دریا بحر قلزم میں گرتا ہے۔ حضرت ہارونؑ نے کوہِ حور پر وفات پائی وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ اسی سلسلہ میں عموریہ / اموریہ کے پہاڑ ہیں اس پر مسجدِ اقصیٰ حضرت سلیمانؑ نے بنوائی تھی۔ اسی سلسلے میں صہیوں کے پہاڑوں پر یروشلم کا شہر موجود ہے۔ بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ صیہون کے پہاڑ پر واقع ہے۔[۵۹] اموری قوم پرانے زمانے میں ان پہاڑوں میں آباد ہونے کی وجہ سے یہ چاروں پہاڑ اموریہ کہلاتے تھے۔ ان کے بادشاہ صیحون کے نام سے یہ پہاڑ نسبت رکھتا تھا۔ یروشلم کے جنوب میں الناصرہ شہر واقع ہے۔ مشرق کی طرف یروشلم سے تھوڑا دور جبلِ زیتون واقع ہے۔ حضرت عیسیٰؑ رات کے وقت یہاں پر عبادت کیا کرتے تھے۔ فلسطین کے شمال کی طرف کے زیریں علاقے "الحولہ" کے میدان سے لے کر جنوب میں "وادی عربی" تک پھیلا ہوا ہے۔[۶۰] فلسطین کا سب سے اہم قدرتی آبی ذریعہ دریائے اردن ہے، اس کا پانی زراعت کے لیے پانی مہیا کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں آبادیاں قائم ہوئیں۔ دریائے اردن قدرتی سرحد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دنیا کی پرانی تہذیبیں دریاؤں کنارے پروان چڑھیں اور فلسطین بھی ایسے ہی وقوع پذیر ہوا۔[۶۱] یبوس بیت المقدس کا پرانا نام ہے۔ عیسائی اور یہودی اسے یروشلم کہتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے زمانے میں یہ نام پڑا۔ اسی شہر کو ایلیا بھی کہا جاتا ہے۔ مصر اور فلسطین کے درمیان درمیان دریائے سینا واقع ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَجَعَلنَا ابنَ مَریَمَ وَاُمَّه اٰیَةً وَّاٰوَینٰهُمَآ اِلٰی رَبوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِینٍ﴾[۶۲] "اور ہم نے مریم کے بیٹے اور اس کی ماں کو نشانی بنایا تھا اور انہیں ایک ٹیلہ پر جگہ دی جہاں ٹھیرے نے کا موقع اور پانی جاری تھا۔" سورۃ بنی اسرائیل میں بھی لفظ "اقصا" سے مراد بیت المقدس ہے۔ حضرت امّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يقُولُ،" مَنْ أَهَلَّ بِحَجَّةٍ أَوْ عُمْرَةٍ مِنْ الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى إِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، أَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔"[۶۳] "ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے جو مسجد الاقصیٰ سے مسجد الحرام تک حج اور عمرہ کا احرام باندھے تو اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، یا اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی۔"

شروع میں فلسطین کا دارالحکومت القدس رہا۔ اسی شہر میں مسجد اقصیٰ اور طور کا پہاڑ واقع ہے۔ اس شہر کے پاس نہ کوئی تجارتی گزر گاہ ہے اور نہ ہی یہ کسی دریا کے کنارے پر ہے۔ یہ شہر پہاڑوں کی چٹانوں پر واقع ہے۔ یہاں پر غذائی ضروریات کی کبھی کمی نہیں ہوئی۔ صرف نہر امّ الدرج اس شہر میں پانی کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ نہر دریائے جیہون سے نکلتی ہے۔ مگر یہ نظام اب موجود نہیں ہے، اب پہاڑی چشموں اور جھرنوں کے پانی کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس شہر میں بہت زیادہ بابرکت مقدس مراکز موجود ہیں۔[۶۴]

مختلف اقوام نے اپنے عقیدے کے پیشِ نظر بیت المقدس کو مختلف ناموں کے منسوب کیا ہے۔ آج بھی یہودی اور عیسائی اسے یروشلم کہتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے زمانے میں اس کا نام یبوس سے بدل کر یروشلم رکھا گیا۔ حضرت سلمانؑ کا فرزند رحبعام اپنے باپ کی وفات کے بعد جب اس نے تخت سنبھالا تو بنی اسرائیل کے دس قبائل اطاعت قبول کرنے کی بجائے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ نے اسرائیل کے نام سے حکومت قائم کی اور سامریہ کو کو مرکز بنایا۔ قبیلہ یہوداہ نے کوئی مخالفت نہ کی اور اس کی حکومت یہوداہ کہلائی جس کا صدر مقام یروشلم ہی رہا۔[۶۵] لیکن یہودیوں نے اسے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ نسبت دی ہے۔ مگر اس شہر کو مسلمانوں نے ہمیشہ بیت المقدس یا القدس ہی کہا۔ قیصر ہادریان نے ۱۳۰ء قبل مسیح میں اسی شہر کو "ایلیا کاپی تولی نا" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ عربی میں "ایلیا" کے طور پر باقی رہا۔ مگر کعب کی روایت کے مطابق "ایک عورت الیا کے آباد کرنے کی وجہ سے اس شہر کا نام ایلیا پڑا۔ ایلیاء کا مطلب ہے "اللہ کا گھر"۔ ایک اور روایت کے مطابق: اپنے بانی ایلیا کے نام پر یہ شہر ہے جو رومہ بن سام بن نوحؑ کا فرزند تھا۔ دمشق، حمص اور فلسطین اس کے بھائیوں کے نام تھے۔ اس شہر کے لوگوں نے بہت کم سال سکون کی زندگی گزاری۔ کیونکہ اس شہر میں خونی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہی۔ ان سب کے باوجود بیت المقدس کی حرمت میں ذرہ بھر بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ عیسائی اس شہر کو بابرکت کہتے ہیں کیونہ حضرت عیسیٰؑ کو اسی جگہ سولی چڑھایا گیا اور صلیب الصلبوت اسی جگہ پر واقع ہے۔ مسلمانوں نے اسے شروع سے پاک ہی کہا ہے۔[۶۶] فلسطین کے مشہور شہر درج ذیل ہیں۔

الناصرہ: یہ بستی یوسف نجّار کی ہے اس میں "کنیسۃ البشارہ" چرچ ہے۔ یہ جلیل کے علاقے میں واقع ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس میں وقت گزارہ تھا۔ یہ شہر طبریہ اور حیفا کے وسط میں ہے۔ عیسائیوں کی نظر میں یہ بہت بابرکت ہے۔ اس شہر کا شمار فلسطین کے شمالی شہروں میں ہوتا ہے۔[۶۷]

الخلیل: اس کی نسبت حضرت یعقوبؑ سے ہونے کی وجہ سے الخلیل کے نام سے مشہور ہے۔ جب حضرت سارہؑ نے وفات پائی تو آپ نے یہ زمین خریدی اور ان کو اس زمیں میں دفن کیا، بعد میں یہ جبرون کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ بھی اسی جگہ دفن ہیں۔ یہاں حضرت یعقوب کے دفن ہونے کے بعد جبرون کے نام سے یہ شہر مشہور ہو گیا۔ بیت الحم کے پاس ہی یہ شہر موجود ہے۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد اس شہر کو رسول اللہ نے تمیم داری کو دے دیا۔[۶۸]

بیت الحم: یہ بیت المقدس کی طرف جنوب ۶ کلو میٹر کی دوری پر ہے۔ یہ ایک پرانا شہر ہے جس کا شمار فلسطین کے اہم قصبوں میں ہوتا ہے۔ "المہد" نام کا چرچ اس شہر میں موجود ہے۔ عیسائی دنیا میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کی وجہ سے اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ زرعی اعتبار سے زیتون اور انگور کے باغات کی وجہ سے بہت مشہور رہا۔ یہ شہر دورِ اسلام میں

جند فلسطین کا حصہ رہا۔ مذہبی رواداری مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں یہاں قائم رہی۔ اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو تحفظ دیا گیا۔[۶۹]

غزہ: جزیرۃ العرب اور مصر و فلسطین کے وسط میں واقع ہے۔ جنوبی فلسطین کا سب سے بڑا شہر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بہت پرانا اور عربوں کی تجارتی لحاظ سے اہم شہر ہے۔ یہ ساحلی شہر ہے۔ امام شافعی کی پیدائش اس شہر میں ہونے کی وجہ سے علمی طور پر بہت مشہور ہے۔[۷۰]

عسقلان: یہ پرانا اور تاریخی شہر ہے جو بحیرہ روم کے کنارے پر ہے۔ خاص بندر گاہ ہونے کی وجہ سے تجارتی مرکز ہے۔ یہ شہر بیت المقدس سے ۶۵ کلو میٹر کے وقفہ سے ہے۔ یہاں پر مساجد میں سے راس الحسین اور مسجدِ عمر کے علاوہ ایک کنواں ہے جس کا نام چاہ ابراہیم ہے اس کے پانی کو پاک تصور کیا جاتا ہے۔ لوگ اس کنواں سے پانی پینے کے لیے گروہ کے گروہ آتے ہیں۔ اسے کنعان بن حام نے آباد کیا تھا۔[۷۱]

یافا: اسے البحر المتوسط اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخی اہم شہر بحر روم کے کنارے واقع ہے۔ اس کی حیثیت القدس کے لیے بندر گاہ ہونے کی وجہ سے بہت اہم ہے۔ اسرائیلیوں کا شہر تل ابیب اسی شہر کے پاس ہے۔

لُد: ۵۶۰۰ قبل مسیح فلسطین کا یہ تاریخی اور پرانا شہر ہے یہ شہر شمال مغرب کی طرف القدس سے ۳۸ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ رملہ کے قیام سے پہلے علاقائی مرکز رہا۔ یہاں پر ۱۹۳۷ء میں بین الاقوامی ائیر پورٹ بنایا گیا۔ یہود نے حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر بتایا کہ اسی شہر سے دجال نکلے گا اور وہ حجرت بنیامین بن یعقوب کی اولاد سے ہو گا۔ اور اے عرب کی اقوام! لُد کے دروازے سے دس گز کے فاصلے پر تم اسے قتل کرو گے۔[۷۲]

رملہ: رملہ کو رام اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ رملہ ہی شروع کے دنوں میں فلسطین تھا۔ کنعانی زبان میں رام اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ اللہ کا عربوں نے اس میں اضافہ کیا۔ پھر رام اللہ نام سے مشہور ہوا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ رام اللہ کی بجائے رملہ بولا جانے لگا۔ اسی شہر میں تمام سرکاری دفاتر اور ادارے موجود ہیں۔ یہاں سفید مسجد بھی پائی جاتی ہے تاہم لوگوں کے مطابق اس میں تین سو پیغمبر دفن ہیں۔[۷۳]

فلسطین کی تمدنی و ثقافتی اہمیت

فلسطین صدیوں سے مختلف تہذیبوں، مذاہب اور ثقافتوں کا مرکز رہا ہے۔ اس خطے میں عرب، کنعانی، رومی اور اسلامی تہذیبوں کے اثرات واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسلامی دور میں یہاں علمی، مذہبی اور شہری تمدن نے ترقی کی اور متعدد مدارس، مساجد اور تجارتی مراکز قائم کیے اس خطے کی تہذیب مختلف اقوام اور ثقافتوں کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔[۷۴]

نتائج

بلادِ شام مشرقِ وسطیٰ کا ایک قدیم اور اہم خطہ ہے جس میں موجودہ شام، لبنان، اردن اور فلسطین کے علاقے شامل ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ خطہ تہذیبوں، مذاہب اور ثقافتوں کے ملاپ کا مرکز رہا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے کئی شہر علمی، سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کے نمایاں مراکز کے طور پر ابھرے۔ دمشق، حلب، حمص، حماہ اور بیت المقدس ان اہم شہروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے مختلف ادوار میں اس خطے کی تہذیبی اور تمدنی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دمشق کو بلادِ شام کا دل کہا جاتا ہے۔ اپنی قدامت، خوبصورتی اور علمی روایت کے باعث یہ شہر صدیوں تک اقتدار اور تہذیب کا مرکز رہا۔

اسلامی دور میں اموی خلافت کے قیام کے بعد جب دمشق دارالخلافہ بنا تو اس کی سیاسی اور ثقافتی اہمیت میں نمایاں اضافہ ہوا اور یہ علم و ادب اور فنِ تعمیر کا ایک درخشاں مرکز بن کر ابھرا۔

حلب کو تجارتی سرگرمیوں میں خاص اہمیت حاصل رہی۔ قدیم تجارتی راستوں پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ شہر مشرق و مغرب کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتا رہا۔ اس کے بازاروں اور تجارتی قافلوں نے معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف تہذیبوں کے باہمی تعلقات کو بھی فروغ دیا۔ اسی طرح حمص اور حماہ اپنی زرخیز زمینوں اور جغرافیائی اہمیت کے باعث علاقائی معیشت میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ بیت المقدس کو مذہبی اور روحانی لحاظ سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں کے لیے مقدس سمجھا جاتا ہے اور صدیوں سے عقیدت اور روحانیت کا مرکز رہا ہے۔ مختصراً یہ کہ بلادِ شام کے یہ بڑے شہر تہذیب، تجارت، علم اور مذہب کے ایسے روشن مراکز تھے جنہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی تمدن کی تشکیل اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

خلاصہ

دمشق، حمص، اردن، لبنان، حلب، طرطوس اور فلسطین خطۂ بلادِ شام کے وہ اہم علاقے اور شہر ہیں جنہوں نے قدیم اور اسلامی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ خطہ اپنی جغرافیائی حیثیت، تہذیبی ورثے اور مذہبی اہمیت کی وجہ سے صدیوں سے عالمی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دمشق دنیا کے قدیم ترین آباد شہروں میں شمار ہوتا ہے اور مختلف ادوار میں سیاسی و انتظامی مرکز کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں یہ شہر خاص طور پر اہم ہو گیا جب Umayyad Caliphate نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ اسی طرح حلب اور حمص قدیم زمانے سے تجارت، دفاعی سرگرمیوں اور ثقافتی تبادلوں کے اہم مراکز رہے ہیں۔ ان شہروں میں مختلف تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں جو ان کی قدامت اور تاریخی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے اردن اور فلسطین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ فلسطین میں واقع بیت المقدس دنیا کے تین بڑے مذاہب "اسلام، عیسائیت اور یہودیت " کے لیے مقدس مقام ہے۔ اس مذہبی اہمیت نے اس علاقے کو روحانی مرکز بنا دیا۔ اردن کا خطہ اپنی زرخیز وادیوں اور دریائے اردن کی وجہ سے زراعت اور انسانی آبادی کے لیے موزوں رہا ہے۔ ساحلی علاقوں میں لبنان اور طرطوس بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہونے کے باعث قدیم زمانے سے بحری تجارت اور ثقافتی روابط کے مراکز بنے۔ ان بندرگاہوں کے ذریعے مختلف اقوام کے درمیان تجارتی اور تمدنی روابط قائم ہوئے۔

تمدنی اعتبار سے یہ خطہ مختلف تہذیبوں جیسے یونانی، رومی، عرب اور اسلامی ثقافتوں کے ملاپ کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے تاریخی آثار، مساجد، گرجاگھر، قلعے اور بازار اس خطے کی تہذیبی عظمت کے گواہ ہیں۔ یوں یہ تمام علاقے مل کر ایک ایسے تاریخی اور ثقافتی ورثے کی تشکیل کرتے ہیں جس نے نہ صرف خطۂ بلادِ شام بلکہ پوری انسانی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

۱۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبداللہ رومی حموی، معجم البلدان، شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ج، ۲، ص، ۴۳۲-۴۳۵

۲۔ نعمانی، شبلی، الفاروق، توصیف پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور، ص، ۱۰۴

۳۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبداللہ رومی حموی، معجم البلدان، ج، ۲، ص، ۵۸۹

۴۔ فضل اللہ العمری، شہاب الدین احمد بن یحییٰ، م، ۷۴۸ھ، مسالک الابصار فی ممالک الامصار، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان، ج، ۱، ص، ۱۸۸

۵۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبداللہ رومی حموی، معجم البلدان، ج، ۲، ص، ۱۰۷

۶۔ ابن عساکر، علی بن حسن بن عبداللہ، (م ۵۷۱ھ)، دار لفکر، بیروت، لبنان، س ن، ج، ۶، ص، ۴۸

۷۔ کے حتی، فلپ، م، ۱۹۷۰، تاریخ شام مترجم غلام رسول مہر، مطبوعہ، غلام علی پرنٹرز، اشرافیہ پارک، فیروز پور روڈ، لاہور، ص، ۵۱۴

۸۔ نعمانی، شبلی، تاریخ اسلام، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ج، ۱، ص، ۲۱۵

۹۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ، تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ، لاہور ج، ۲، ص، ۱۴۶

۱۰۔ امیر علی، سیّد، تاریخ عرب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص، ۱۷۸

۱۱۔ کے حتی، فلپ، تاریخ شام، ص، ۵۱۴

۱۲۔ نعمانی، شبلی، الفاروق، ص، ۱۰۵

۱۳۔ ابن حوقل، ابو القاسم محمد بن حوقل، المسالک والممالک، دار صادر، بیروت، ص، ۱۶۱

۱۴۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبداللہ رومی حموی، معجم البلدان، ج، ۲، ص، ۳۰۳

۱۵۔ کے حتیٰ، فلپ، تاریخ شام، ص، ۲۵۳

۱۶۔ البلاذری، ابو الحسن احمد بن یحییٰ، م، ۲۰۳ھ، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج۔ ۱، ص: ۱۹۷

۱۷۔ نعمانی، شبلی، سفر نامہ روم و مصر و شام، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص، ۲۱۵

۱۸ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبداللہ رومی حموی، معجم البلدان، ج، ۲، ص، ۳۰۴

۱۹۔ الطبری ، محمد بن ابن جریر بن یزید، م: ۳۱۰ھ، تاریخ الامم والملوک، مطبعہ الاستقامہ، قاھرہ، ۱۹۴۹ء، ج: ۲، ص: ۳۶۱

۲۰۔ علامہ ذہبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان، (م ۷۴۸ھ) تاریخ اسلام، دار الکتب العلمیہ، ج، ۳، ص، ۱۱۳

۲۱۔ المقدسی، محمد بن احمد المقدسی (م ۹۹۰ء) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، دار صادر، بیروت لبنان، ص، ۱۵۹

۲۲۔ اکبر شاہ نجیب آبادی، تاریخ اسلام، مکتبہ اسلامیہ لاہور، ج، ۱، ص، ۷۲

۲۳۔ ڈاکٹر احمد شلبی، تاریخ المسیحیۃ، دار القلم، ج، ۱، ص، ۱۳۴

۲۴۔ البلاذری، ابو الحسن احمد بن یحییٰ، م، ۲۰۳ھ، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج۔ ۱، ص: ۱۸۰

۲۵۔ الطبری ، محمد بن ابن جریر بن یزید، (م: ۳۱۰ھ)، تاریخ الامم والملوک، مطبعہ الاستقامہ، قاھرہ، ۱۹۴۹س ء، ج، ۳، ص، ۶۳۲

۲۶۔ مسعود الندوی، تاریخ الدعوۃ اسلامیہ فی الہند، دار العربیہ، اسلام، ص، ۳۴۱

۲۷۔ المقدسی، محمد بن احمد المقدسی (م ۹۹۰ء) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، دار صادر، بیروت لبنان، ص، ۱۵۹

۲۸ کے حتیٰ، فلپ، تاریخ شام، ص، ۲۵۲۔

۲۹۔ ڈاکٹر محمد سہیل طقوش، تاریخ بلادِ شام قدیم، دار النفائس، ص، ۸۸

۳۰۔ محمود احمد غازی، محاضرات تاریخ اسلام، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، ج، ۱، ص، ۴۱

۳۱۔ ابن کثیر، ابو الفدا اسماعیل ابن عمر، (م ۷۷۴ھ)، البدائیہ والنہایہ، بیروت مکتبہ الشرکتہ العلمیہ، ، س ن، ج، ۸، ص، ۳۳۱

۳۲۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبداللہ رومی حموی، معجم البلدان، دار صادر، بیروت، ج، ۲، ص، ۱۵

۳۳۔ کے حتیٰ، فلپ، تاریخ شام، ۲۵۴۔

۳۴۔ جرجی زیدان، جرجی بن حبیب (م ۱۹۱۴ء)، تمدن روم، دار صادر بیروت، لبنان، ج، ۲، ص، ۱۱۹

۳۵۔ جرجی زیدان، جرجی بن حبیب (م ۱۹۱۴ء) تاریخ نصاریٰ، ج، ۲، ص، ۲۰۱

۳۶۔ البلاذری، ابو الحسن احمد بن یحییٰ، م، ۲۰۳ھ، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج۔ ۱، ص: ۱۴۸

۳۷۔ ہیکل، محمد حسین(م۱۹۵۶ء)، تاریخ اسلام، قاہرہ، مصر،۱۹۳۵ء،ج،۲،ص،۲۱۵
۳۸۔ ابنِ شداد، بہاؤالدین ابن شداد،(م۶۳۲ھ) سیرت صلاح الدین ایوبی، دار صادر، بیروت، ص،۱۸۱
۳۹۔ محمد فرید بیگ، تاریخ سلطنتِ عثمانیہ، اردو بازار لاہور، ج،ا،ص۲۹۲
۴۰۔ کے حتی، فلپ، تاریخ شام، ص۳۶
۴۱۔ ایضاً، ص،۴۱
۴۲۔ محمد سہیل طقوش، تاریخ فینیقیین، دار صادر، بیروت، ج،ا،ص،۱۰۱
۴۳۔ کے حتی، فلپ، تاریخ شام، ص،۱۴۳
۴۴۔ ابن بطوطہ، سفر نامہ ابن بطوطہ، ترجمہ: رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع پنجم،۱۹۸۶ء، ص،۹۶
۴۵۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبد اللہ، معجم البلدان، دار صادر، بیروت، ج،۲،ص،۲۴۸
46- https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AD%D9%84%D8%A8 -444
۴۷۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبد اللہ، معجم البلدان، ج،۲،ص،۲۴۸
۴۸۔ ابن بطوطہ، سفر نامہ ابن بطوطہ، ترجمہ: رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع پنجم،۱۹۸۶ء، ص،۹۶۔
۴۹۔ اسٹرنج، جی، لی، بلادِ فلسطن وشام، ترجمہ، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی،۱۳۵۱ھ، دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن، ص،۴۶۴
۵۰۔ اسٹرنج، جی، لی، بلادِ فلسطین وشام، ترجمہ، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی،(م،۱۳۵۱ھ)،، ص،۴۶۵
۵۱۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبد اللہ، معجم البلدان، ج،۲،ص،۲۴۹۔
52- Walter McLeod, The Geography of Palestine, London, 1847, p,24
۵۳۔ ممتاز لیاقت، تاریخ بیت المقدس، سنگِ میل پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور طبع دوم،۱۹۰۳ء، ص،۱۹
۵۴۔ المسعودی، الحسن بن حسین(م،۳۴۶ھ)، مروج الذہب ومعادن الجواہر، دار الاندلس الطباعۃ والنشر، بیروت لبنان،۱۹۶۵ء، ج،ا،ص۴۳
۵۵۔ ابن سعد، محمد بن سعد،(م۲۳۰ھ)، طبقات ابن سعد، ترجمہ: عبد اللہ العمادی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ج،ا،ص،۶۲
۵۶۔ ابن کثیر، ابو الفدا اسماعیل ابن عمر(م،۷۷۴ھ)، البدائیہ والنہایہ، بیروت مکتبہ الشرکتہ العلمیہ، س ن، ج،ا،ص،۲۱۰
57- George Adam Smith, The Historical Geography of Holy Land London , Hodder & Stoughton,1894, jild,1, p,6
۵۸۔ مراد آبادی، محمد نعیم الدین،(م۱۹۴۸ء)، تفسیر خزائن العرفان، ترجمہ: احمد رضا خان، مکتبہ المدینہ، کراچی، ص،۶۱۱
۵۹۔ ڈاکٹر مہندس یحییٰ، حسن وزیری المسجد الاقصی، ام الہیکل المزعوم،۹ حجۃ النشر المجلس السلامی العالمی القاہرہ،۲۰۰۰ ص،۱۴۰
۶۰۔ ممتاز لیاقت، تاریخ بیت المقدس، ص ۱۹
61- .James McDougall, Geography of Palestine, Edinburgh. P. 58-61
۶۲۔ القرآن:۲۳:۵۰
۶۳۔ ابو داؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب فی المواقیت، لاہور، اسلامی اکادمی،۱۹۸۳، رقم الحدیث،۱۷۴۱
۶۴۔ ممتاز لیاقت، تاریخ بیت المقدس، ص۲۰
۶۵۔ قادری، اخلاق احمد، تاریخ عالم، سٹی بک پوائنٹ، کراچی،۲۰۱۱ء، ص،۱۵۶
۶۶۔ ممتاز لیاقت، تاریخ بیت المقدس، ص۲۱-۲۲
۶۷۔ مقدسی، ابن قدامہ، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ترجمہ: محمد بن عبد الواحد،(م،۶۴۳ھ) طبع ترکی،۱۹۹۴ء، ج،ا،ص۱۷۶
۶۸۔ البلاذری، ابو الحسن احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، ج،ا،ص،۱۴۷
۶۹۔ یاقوت الحموی، یاقوت بن عبد اللہ رومی حموی، معجم البلدان، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ، لمیٹڈ، لاہور، ج،ا،ص،۶۳۸
۷۰۔ البلاذری، ابو الحسن احمد بن یحییٰ، م،۲۷۹ھ، فتوح البلدان، ص،۱۵۱
۷۱۔ الطبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد(م،۳۶۰ھ) المعجم للطبرانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج،۱۱،ص،۸۸
۷۲۔ الطبری، محمد بن ابن جریر بن یزید، م: ۳۱۰ھ، تاریخ الامم والملوک، ج:۲، ص:۴۷۰
۷۳۔ ایضاً، ص:۴۷۰
۷۴۔ ممتاز لیاقت، تاریخ بیت المقدس، ص،۲۴

❖❖❖